Bazm-i-Akhir

باقی رہی نہ شمع نہ پروانہ رہ گیا وہ بجھ گئی یہ جل گیا افسانہ رہ گیا

بزمِ آخر

از
مفتی محمد انتظام اللہ صاحب
شہابی اکبر آبادی

آگرہ کی سنہ ۱۲۴۵ھ و سنہ ۱۲۷۷ھ مطابق سنہ ۱۸۳۰ء و سنہ ۱۸۶۲ء

از جناب مولا...
سابق انسپکٹر...

ایجوکیشنل بک ہاؤس
سول لائن۔ شمشاد بلڈنگ علی گڑھ

Educational Book House,
Civil Lines, Shamshad Building,
ALIGARH, (U. P.)

باقی رہی نہ شمع نہ پروانہ رہ گیا
وہ بجھ گئی، یہ جل گیا، افسانہ رہ گیا

بزمِ آخر

آگرہ کی ۱۲۴۵ھ ۱۸۳۰ء و ۱۲۷۷ھ ۱۸۶۲ء تک کی

ادبی صحبتیں

از جناب مفتی انتظام اللہ شہابی صاحب اکبرآبادی

مع تعارف

از جناب مولٰنا مولوی محمد ابرار حسین صاحب فاروقی ایم اے، فاضل مصر و منشی فاضل
سابق انسپکٹر مدارس و ہیڈ ماسٹر و لیکچرار اردو و فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

پبلشرز
ایجوکیشنل بک ہاؤس
سول لائن شمشاد بلڈنگ۔ علی گڑھ

تعارف

از
جناب ابو الفاروق محمد ابرار حسین صاحب فاروقی گوپاموی ایم اے (علیگ)، فاضل مصر
منشی فاضل، سابق انسپکٹر مدارس عربیہ، [illegible] لیکچرار اردو و فارسی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

علم و ادب کا میدان اتنا وسیع ہے جس کے حدود کا قائم کرنا مشکل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کوشش ضرور کی جاتی رہی اور آئندہ بھی کی جاتی رہے گی کہ اسلاف کے جو اقسام کے علمی کارناموں کو کسی نہ کسی طرح سے منظر شہود پر لایا جائے تاکہ ان کی افادیت بڑھتی رہے شاعری علم و ادب کی وہ ممتاز شاخ ہے جو فی الحقیقت انسانی فطرت میں بلا امتیاز رنگ ملت ودیعت ہے۔ اقوام عالم نے اس میں وہ وہ جوہر دکھائے ہیں جو صفحۂ قرطاس پر آکر ہمارے لئے کسی نہ کسی طرح سے رہبر ہوئے۔ جس کی مثال علمی و ادبی تاریخ کے اوراق پیش کرتے ہیں۔

شعر عرب

بہرحال زبان و ادب کی یہ شاخ اتنی بڑھی کہ بعض اوقات اس کے جو نکتوں نے قوموں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ عربی کی شاعری کا عروج کس سے پوشیدہ ہے۔ ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی کے مجلدات جو ہزاروں صفحات پر مشتمل ہیں اس عروج کی زندہ مثال ہیں اور جو عربوں اور عربی دانوں کے لئے اب بھی سرمایہ ہیں۔

امرؤ القیس، نابغہ ذبیانی، اخطل، طرفہ، اعشیٰ، متنبی، اصمعی ابونواس وغیرہ نے زمانہ جاہلیت سے لے کر خلفائے عباسیہ کے عہد تک اپنی فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے ہیں۔ حضرت حسانؓ اور حضرت کعبؓ نے اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمَۃ

کی تفسیر کرکے اپنی اعجاز بیانی سے بارگاہِ نبوت سے کیسے کیسے اعزاز پائے۔

شعرِ فارسی

فارسی شاعری نے جو گل کھلائے اور انسانوں کی زندگیوں میں جو کایا پلٹ کی وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ یہ فردوسی ہی تھا جس نے شاہنامہ لکھکر ایران کے قدیم تمدن کو اجاگر کیا اور گویا خیالی تصویروں کو زال رستم بنایا۔ رودکی نے آلِ ساسان کو زندۂ جاوید کیا۔ حکیم سنائی نے "حدیقۃ الحقیقۃ" لکھکر وہ باغ لگایا جس سے تصوف کی دنیا باغ باغ ہو گئی۔ مولانا روم نے مثنوی لکھکر جامی کو ؎

ہست قرآں در زبانِ پہلوی

کہنے پر مجبور کیا۔ نظامی نے "پنج گنج" پیش کرکے معرفت کے خزانے کھول دیئے حافظ اپنی "شرابِ ناب" سے دنیا کو "مستِ الست" کر دیا۔ سعدی نے آپ بیتی کا وہ "بوستاں" رچایا کہ جس کے پھول اب تک مہک دے رہے ہیں۔ خسرو نے اپنے کلام "معجز نظام" سے "طوطیِ ہند" اور "ترک اللہ" کا لقب پایا۔ عرفی، فیضی، کلیم، صائب وغیرہم نے بادشاہوں کی محفلوں کو جگمگایا۔

شعرِ اُردو

محمد شاہی "اردو" نے رفتہ رفتہ فارسی کو بے دخل کرکے پورے ہندوستان پر ایسا قبضہ جمایا کہ آج جگہ جگہ اسی کے گیت گائے جاتے ہیں سودا کی سودائیت کو اس نے نباہا، انشا کو انشا پرداز بنایا۔ میر تقی میر کو میر کر دیا۔ ذوق کے ذوق کو دوبالا کرکے "خاقانیِ ہند" کا ان کو لقب دلوایا۔ غالب کو سب پر غالب رکھا۔ میر انیس اور مرزا دبیر کو کربلا کی طرف متوجہ کرکے مرثیہ گوئی کا تاج ان کے سر پر رکھا۔ داغ کو اپنا پجاری کرکے سادگی، روانی اور لطافت کا پتلا بنا دیا۔ امیر مینائی کو اپنا مرید کرکے نرمی، متانت، سنجیدگی اور پاکیزگی کا مرشد ٹھہرایا۔ اقبال کو مجسم درد بنا کر اسلام اور مسلمانوں کا شیدائی کیا، چکبست کو اپنے سے وابستہ کرکے موت و حیات کا فلسفہ سکھایا۔ غرض کہ اس بے یار و مددگار زبان نے اپنی

قلیل ترین عمر میں ایسے ایسے شیدائی پیدا کر دیے کہ وہ اب تک اپنے کلام کی وجہ سے زندہ جاوید ہیں اور رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔ ہر زمانہ کے شاعروں کی، جن کی تاریخ قدیم نہیں ہے۔ گلدستے۔ ان کی نازک خیالی، بلند پردازی، مضمون آفرینی اور ادبی کاوشوں کے شاہد ہیں۔ ان کے مختلف النوع کلام ہر صنفِ شاعری کے روشن مظہر ہیں بلکہ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ جو کچھ کہنا تھا زبان کے شیدائی وہ سب کچھ کہہ گئے اور زبان کی نوک پلک درست کر کے ہمارے لئے راستہ صاف کر گئے۔

اُردو کے مشاعرے

مجھے یہاں شعر و سخن کی تاریخ نہیں لکھنی ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ اسلاف کے اشعار نہ صرف ادبیت کے بڑھانے میں ممد و معاون ہوتے ہیں بلکہ شعرا کے اندازِ بیان کی معلومات سے کلام کی افادیت کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ روز کا مشاہدہ ہے کہ بجائے دیوان کے مطالعہ کے اگر صاحب دیوان سے استفادہ کا موقع مل جائے تو اس کلام کا اثر کچھ اور ہی ہو رہا ہے۔ اسی لئے یہ مشہور ہے: ؎

تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں

محض اسی وجہ سے شعر و سخن کی مجلسوں کی بنیاد پڑی جن کو "مشاعرہ" کا نام دیا گیا اور جن میں اساتذہ اپنا کلام سنا کر داد اور صلے پاتے تھے اور نو آموز و مبتدی شعرا اپنا کلام سنا کر حوصلہ افزائی سے مالا مال ہوتے تھے۔ غرض کہ یہی وہ علمی و ادبی مجالس تھیں اور رہیں گی جو زبان و ادب کی صحیح معنوں میں خدمت گزار ہیں۔ اُردو زبان کی ترقی میں بھی ایک ممتاز رتبہ ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس نے بھی علمی مجلسوں کو ایسا ہی گرمایا جیسا کہ مستند زبانیں گرماتی رہیں۔ شاہی اور درباری مشاعروں کے علاوہ عام و خاص مشاعرے بھی ہوتے رہے جن میں بڑے بڑے اساتذۂ وقت نے شرکت کی اور اپنے زورِ کلام سے ان کو کامیاب بنایا۔ ان کے کلام مع ان کی خصوصیات کے آج تک سفینوں اور سفینوں میں محفوظ ہیں۔

دہلی کا آخری مشاعرہ

دہلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ثانی کا عہد اگر ایک طرف زبان کی ترقی کا عہد کہا جا سکتا ہے تو دوسری طرف حکومت کے خاتمہ کا بھی۔ شاید اسی سبب سے قدرت نے آخری علمی و ادبی مجلس رچانے کا خیال دلی والوں کے دل میں ڈال دیا تھا۔ مشاعرہ ہوا اور خوب ہوا۔ ساری رات ہوا۔ مشاعرہ کیا بلکہ "ساحرہ" ہو گیا۔ شاہی غزل سے ابتدا ہوئی اور استاد شاہ کے کلام پر خاتمہ ہوا۔ اور جس وقت استاد ذوق نے اپنا یہ آخری شعر پڑھا:

> مؤذن مرحبا بر وقت بولا
> تری آواز مکے اور مدینے

اسی وقت "مؤذن" نے اللہ اکبر کی صدا دی گویا مؤذن حضرت ذوق کے اشارہ ہی کا منتظر تھا۔ اس مشاعرہ کے دیکھنے والے اب کہاں۔ خدا ان کو جنت نصیب کرے جنھوں نے اس علمی مذاکرہ کو سفینوں میں محفوظ کر دیا تھا اور جس کو مزید آراستگی کے ساتھ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے ایک نئے انداز سے گلدستہ کی شکل میں پیش کیا اور اس کا نام "دلی کا ایک یادگار آخری مشاعرہ" رکھا۔

علی گڑھ کا تمثیلی مشاعرہ

کچھ عرصہ کے بعد میرے دوست محترمی مولوی محمد احسن صاحب مارہروی مرحوم المتخلص بہ احسن نے علی گڑھ کالج میں رام پور کے درباری مشاعرہ ۱۸۷۸ء کی نقل کالج کے طلبا سے کرائی اور اس کا نام "تمثیلی مشاعرہ" رکھا۔ یہ اعلیٰ حضرت نواب کلب علی خاں بہادر والیِ رام پور کے عہد کے مشاعرہ کی نقل تھی۔ جس میں حضرت امیر مینائی جو وہاں کے ملک الشعرا تھے میر مشاعرہ تھے۔ اور میرے نانا مخدوم و محترم حضرت شمس العلما علامۂ زماں مولانا مولوی عبد الحق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ بطور معزز مہمان کے شریک تھے۔ بہت کامیاب تمثیل رہی۔ مشاعرہ سے زیادہ اس کی واہ واہ ہوئی۔ حضرت احسن مرحوم نے اس نقل یا تمثیل کو زیب قرطاس کیا حتیٰ کہ مصنوعی امیر اور دوسرے شعرا کے فوٹو بھی اس گلدستۂ تمثیل میں دیئے گئے اور اس طرح مرحوم نے قارئین کو بھی اپنے زورِ قلم سے ایک حد تک سامعین کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ بہر حال ان دونوں حضرات نے جس انداز سے ان قدیم مشاعروں کی تصویر کھینچی ہے

آگرہ اور بزمِ آخر

اس کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔

یہ دونوں "تمثیلیں" جو اُردو ادب کے میدان میں بالکل انوکھی تھیں ایسی نہیں تھیں جو ادب اُردو کے مذاق میں ایک نئے باب کا اضافہ نہ کرتیں چنانچہ میرے عزیز محترم برادرم مفتی انتظام اللہ صاحب صدیقی شہابی گوپاموی ثم اکبر آبادی نے "بزمِ آخر" لکھ کر اُن قیمتی جواہرات کی نمائش کی، جن کو جوہریوں کی آنکھیں ایک مدت تک ڈھونڈھ رہی تھیں۔ برادرم موصوف کا نوکِ قلم اب کسی تعارف و تعریف کا محتاج نہیں ہے جس نے ان کی عمر کے اعتبار سے اس قلیل مدت میں اُردو کی وہ خدمات انجام دیں جن کی وجہ سے وہ بحمد اللہ موجودہ زمانہ کے مصنفین کی صف اوّل میں ہیں۔

"بزمِ آخر" آگرہ کے پیچھے بعد دیگرے کئی "ادبی مجلسوں" اور "علمی صحبتوں" کا مجموعہ ہے جو اگرچہ عملاً مشاعرے ہی تھے لیکن چونکہ ایک محدود اور مخصوص اصحاب ذوق کی یہ مجلسیں مشتمل تھیں اس لئے اصطلاحاً ان کو مشاعرہ نہیں کہا جا سکتا ہے اور نہ اس وقت کہا گیا یہ "بزمِ آخر" آگرہ کی انیسویں صدی کے آخر کا وہ ادبی مرقع ہے جس میں حضرت غالب آخری بار شریک ہوئے ہیں اور پھر ان کو اپنے آبائی وطن میں آنا نصیب نہیں ہوا اور نہ پھر آگرہ کو ایسی "بزم" نصیب ہوئی۔ اس لئے مفتی صاحب نے "بزمِ آخر" بہت ہی موزوں نام رکھا۔ حضرت غالبؔ زمانہ دراز کے بعد اتفاقاً آگرہ میں آ گئے۔ آمد کا چرچا تو پہلے ہی سے تھا اب آ جانے کے بعد اصحاب ذوق کا جوش کیسے رک سکتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تقریباً سب ہی لوگ ان کی نازک مزاجی سے واقف تھے اس لئے مشاعرہ منعقد کر کے کس کو جرأت تھی کہ ان کو دعوتِ شرکت دیتا۔ مرحوم خود بھی واقف تھے کہ آگرہ پہنچتے ہی مشاعرہ با… پیچھا لیں گے اس لئے انہوں نے آتے ہی سنا دیا تھا:-

"مشاعرہ نہ کرنا میں دلی میں بھی نہیں آتا جاتا ہوں، کبھی کبھی
قلعۂ معلی میں پکڑ بلایا جاتا ہوں۔ مجھے مشاعروں سے اب جی کھولتا ہے"

مفتی انعام اللہ صاحب مرحوم ساحر اور دوسرے لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور تمنائے مشاعرہ دل میں رکھتے تھے، یہ نوٹس ملتے ہی ساحر مرحوم کو موقع مل گیا اور انھوں نے عرض کیا:-

"صرف شعر و سخن کی ادبی صحبت رہے گی"

درخواست منظور ہوئی اور "ادبی صحبت" کی تیاری شروع ہو گئی۔ چنانچہ حسب قرارداد اسی رات کو مجلس شعرا گرم ہوئی اور شہر کے ہندو مسلمان ممتاز اصحاب ذوق اس میں شریک ہو کر مستفید و محظوظ ہوئے۔

برادرم مفتی انتظام اللہ صاحب نے اپنے زور قلم سے اس "صحبت" کی ایسی تصویر کھینچ دی ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے اس وقت کا پورا منظر آجاتا ہے۔ اچھوتے پیرائے میں ہر ایک شاعر کا مجملاً تعارف بھی کرایا اور اس کے کلام و طرز ادا کو بھی بیان کر دیا۔ "قل ما دل" اسی کو کہتے ہیں۔

اسی "بزم آخر" کا دوسرا جز سنہ ۱۲۴۵ھ (۱۸۳۰ء) کا مشاعرہ خاص ہے جو مہاراجہ بلوان سنگھ نے منعقد کیا تھا اور سنہ ۱۲۷۳ھ کا وہ "بڑا مشاعرہ" ہے جو بابو بینی پرشاد صاحب وکیل نے ترتیب دیا تھا۔ ان دونوں میں شہر کے تمام ممتاز شعرا موجود تھے، جن کے کلاموں کو پڑھ کر بے ساختہ حضرت خواجہ بے خبر کے اس شعر کو دہرانا پڑتا ہے: ؎

اس بزم میں سب بیٹھے ہیں اُٹھ جانے کو ∴ ہر جمع کا انجام پریشانی ہے

بہرحال یہ صحبتیں اب خواب و خیال ہو گئیں۔ راجہ بلوان سنگھ نے کیا خوب کہا: ؎

راجہ رہا نہ تاجِ فریدوں نہ تختِ جم ∴ افسانے کیقباد و سکندر کے رہ گئے

ہم کو مفتی صاحب جیسے صاحب ذوق حضرات کا شکر گزار ہونا چاہئے جن کی بدولت پچھلی ادبی صحبتوں کی تصویریں الفاظ میں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔

میں مفتی صاحب کے زور قلم کے لئے صرف یہی دعا کروں گا کہ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

۷۸۶

بزمِ آخر

باقی رہی نہ شمع نہ پروانہ رہ گیا
وہ بجھ گئی، یہ جل گیا، افسانہ رہ گیا

ایک صدی تک جاٹ و مرہٹہ گردی سے آگرہ تباہ و برباد رہا۔ عمارتیں ڈھائی گئیں علمی ذخیرے برباد کئے گئے شرفا اور اہل علم دلی اور لکھنؤ جا بسے جو لوگ رہ بھی گئے وہ مصیبت کی گھڑیاں سہتے رہے لارڈ لیک کا بھلا ہو (۱۸۰۳ء) جس نے درندوں سے نجات دلائی، آگرہ کے دن پھرے۔ کچھ عرصہ بعد الہ آباد سے صدر نظامت اُٹھ آیا۔ اس کے وابستگان پورب کے اہل علم حضرات زیادہ تر تھے۔ اُن کی آمد نے شہر کی رونق کو بڑھا دیا تھا۔ علمی چرچے ہونے لگے، مشاعرے اور ادبی صحبتیں رنگ لانے لگیں۔ پھر سے سوتی بستی جاگ اُٹھی۔ راجہ کاشی آ بسے تھے، دادِ دہش سے اگلوں کی یاد تازہ کرنے لگے۔ شعر و شاعری میں لے دے کے میاں نظیر کے شاگردوں کی گرم بازاری تھی، ان کے بیٹے خلیفہ گلزار علی اسیر کا ڈنکا بج رہا

تھا - راجہ کاشی کے خلف مہاراجہ بلوان سنگھ ان کے شاگرد ہوئے اور آئے دن مشاعرہ کیا کرتے ان کے دوست کے صاحبزادہ مولوی افہام اللہ ساحر[۱] جن کا گھر علما اور شعرا کا مرکز بنا ہوا تھا ان کے باپ ولسن گردی کے لپیٹ میں آتے آتے بچ رہے، وکالت ترک کی، نواب وزیر الدولہ بہادر کی طلبی پر ٹونک چلے گئے حضرت شہید پر بھی نزلہ گرا تھا، آخر مصیبتیں جھیل کے الہ آباد جا بسے - ساحر کی شاعری جناب شہید اور شیفتہ کی نگرانی میں پروان چڑھی تھی، مشغلے شعر و شاعری کے تھے جو صاحب کمال آگرہ آتا ان کے یہاں ادبی صحبت منعقد کرتے اور خاطر و تواضع میں بچھے بچھے جاتے -

مرزا نوشہ (غالب) وطن آ نکلے، بچپن کے دوست مرزا حسام الدین بیگ رئیس برادر کے یہاں ٹھہرے - جس جس کو خبر لگی وہ ملنے آیا - مرزا صاحب کی ننھیال میں سے کوئی نہ رہا تھا جو تھے وہ باہر چلے گئے تھے - پھوپھی زاد بہن موتی بیگم مرزا اکبر بیگ برلاس کو بیاہی تھیں ان سے مرزا وقار علی بیگ تحصیلدار تھے - ان کو مرزا صاحب کی آمد کی خبر لگی اپنے ساتھی جناب ساحر کو لے کے مرزا حسام الدین بیگ کے کمرہ پر جا پہونچے - ہر دو بزرگ اگلی پچھلی باتوں میں مشغول تھے - انھوں نے جاتے ہی ادب سے سلام کیا - مرزا حسام الدین بیگ نے دعائیں دیں اور کہا منجھلے میاں اور وقار علی آج تم دونوں اس طرف کیسے آ نکلے وقار علی تم تو مرزا نوشہ کی سن کے آئے ہوگے، مرزا غالب سے کہا - نواب صاحب میاں وقار علی کو تو نہیں پہچانتے

---

[۱] خمخانۂ جاوید حصہ چہارم ذکر ساحر مفتی افہام اللہ

[۲] داستان تاریخ اردو ز ذکر مولانا محمد میمن (انا پوری)

ہو گے۔ ان کو دیکھا ہو گا تو بہت چھوٹا دیکھا ہو گا۔ آپ کے مرزا اکبر بیگ کوتوال کے بیٹے میں بڑے سعادت مند ہیں تحصیلدار ہو گئے ہیں۔ آج کل رخصت پر ہوں گے اور منجھلے میاں یہ خواجہ غلام غوث خاں بہادر کے برادر نسبتی ہیں۔ ان کو شعر و سخن سے بڑی دلچسپی ہے اور یہ مشاعرہ اور محفل شعر و سخن اکثر کیا کرتے ہیں۔ ہیں کم عمر مزاج بوڑھوں کا سا پایا ہے۔ مرزا صاحب نے اپنی بہن کے مرنے کا حال پوچھا اور ساحر کی طرف رخ کر کے مرزا حسام الدین سے کہا۔ مرزا صاحب! ان کے والد مفتی انعام اللہ خاں بہادر کو دلی میں دو ایک دفعہ دیکھا ہے وہ مسٹر کول بروک ریزیڈنٹ کے محکمہ میں سررشتہ دار تھے اور منشی سید لیاقت حسین میر منشی تھے ان سے پھر ملاقات نہ ہوئی۔ مولانا آزردہ کے دوست ہیں اکثر وہ ذکر کیا کرتے ہیں۔ ان دونوں سے مخاطب ہو کے بولے کہئے: کیا ارادے ہیں، مشاعرہ کرنا میں دلی میں بھی نہیں آتا جاتا۔ کبھی قلعہ معلی میں پکڑ بلایا جاتا ہوں۔ مجبوراً ہے اب جی کھونے لگتا ہے۔ ساحر صاحب نے کہا۔ آپ دونوں کی اگر یہاں ہے تو صرف شعر و سخن کی ادبی صحبت رہے گی، مگر آپ دونوں غریب خانہ پر بھی کھانا کھائیں گے، آج خواجہ صاحب بھی دورہ سے واپس آنے کو ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے، دل شکنی میرا شیوہ نہیں، ضرور ہم دونوں آویں گے۔ خوش خوش دونوں صاحب رخصت ہو گئے

دوسرے دن حویلی راجہ دیوان سنگھ (نیل کھاٹ) میں جس میں ساحر رہتے ہیں اچھی خاصی چہل پہل تھی، مرزا ذکار علی بیگ بھی ساحر صاحب کے ساتھ انتظام میں لگے ہوئے تھے۔ عشا کی نماز کے بعد مدعو حضرات نے آنے شروع

ہوئے، بابو بینی پرشاد وکیل۔ سید کاظم حسین وکیل شیخ احمد علی شیون، منشی زین العابدین خاں شورش[1]، مولوی طفیل احمد خیر آبادی، مہاراجہ بلوان سنگھ متخلص بہ راجہ، افضل حکیم سید نظام علی خاں ہمدانی، شیخ بلاقی زرد، مولوی واجد علی صاحب شمس العلوم یکے بعد دیگرے آئے اور محفل میں رونق افروز ہوئے ساحر صاحب کے بڑے بھائی مولوی اکرام اللہ صاحب "تصویر الشعرا"[2] ہر ایک کو حسب مرتبہ بٹھاتے جاتے تھے، اتنے میں ہوادار پر خواجہ غلام غوث بیخبر آئے اور مرزا حسام الدین بیگ اور نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی پالکیاں آکے لگیں۔ تینوں صحن میں آپس میں ملے۔ بیخبر اور مرزا صاحب ہاتھ میں ہاتھ ڈالے محفل میں داخل ہوئے۔ صدر میں مرزا غالب بٹھائے گئے۔ پان حقہ سے تواضع مدارات کی گئی۔ کچھ دیر بات چیت ہوتی رہی۔ شہ نشین پر دسترخوان لگا ہوا تھا۔ سب حضرات اُٹھ گئے۔ بابو صاحب اور راجہ صاحب کے لئے فواکہات کے قاب لاکے رکھے گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کے محفل میں حسب مراتب آکے سب صاحب بیٹھ گئے۔ اتنے میں آگرہ کی مشہور و معروف رقاصہ دُرگا بائی متخلص بہ صنم آگئی نو عمر، خوبصورت، پیشانی پر قشقہ لگا ہوا، اس سج دھج سے آئی اور آداب و کورنش اس انداز سے بجا لائی کہ جس کو دیکھو وہ بُت بنا ہوا تھا حتی کہ ہر ایک کی نظر اُس پر تھی، مرزا غالب تو بے ساختہ کہہ اُٹھے

[1] شورش ابن میر محمد عطا حسین خاں مصنف نوطرز مرصع صاحب دیوان زبان شعرا ص ۲۵۴

[2] داستان تاریخ اردو۔

سیہ چوٹی، زر افشاں مانگ، سبز اس پہ دوشالا ہے
تماشا ہے پرِ طاؤس میں کالے کو پالا ہے

صنم دُرگا بائی صنم بیٹھ گئی، اربابِ محفل نے کہا تم ہی اپنے کلام سے اس صحبتِ شعر و سخن کا آغاز کرو۔ عذر و معذرت کے بعد کہتی ہے ؎

کچھ دوائے دل و جگر نہ ہوئی — مر گئے ہم اُنھیں خبر نہ ہوئی
اپنی صورت مٹا ہی دی ہم نے — ان کی اس پر بھی کچھ نظر نہ ہوئی
دل پہ تاثیر کر گئی اُن کے — شکر ہے آہ بے اثر نہ ہوئی
دل و جاں ہجر میں گئے ایسے — ایک کو ایک کی خبر نہ ہوئی

رہیں اب دیر ہی میں چل کے صنم
اپنی کعبہ میں تو بسر نہ ہوئی

زر جنابِ زرد سے اہلِ محفل مخاطب ہوئے۔ شیخ بلاقی ابن سعد اللہ نام ہے زرد تخلص ہے اصل لاہور ہے، عرصہ سے باپ دادا یہیں رہتے آئے ہیں۔ معمولی لکھے پڑھے ہیں، سادے کاری کا شغل ہے۔ مثنوی موسیٰ و فرعون لکھی۔ استاد دل کی صحبت میں زیادہ رہتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

شبِ ہجراں بسر نہیں ہوتی — نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی
وہم میں کیوں پھنسا ہے اے بہزاد — ان بتوں کی کمر نہیں ہوتی

ل؎ شعر و سخن از نیاز علی پریشاں سندیلوی

کیا تماشا ہے ہم تو مرتے ہیں ۔ ان کو اصلا خبر نہیں ہوتی
کیا غضب ہے کہ وصل میں بھی یار ۔ بات دو دو پہر نہیں ہوتی
کیوں نہ جینے سے یاس ہو مجھکو ۔ صحت اے چارہ گر نہیں ہوتی
پتلیاں پھر گئیں ہماری ہائے ۔ ان کی سیدھی نظر نہیں ہوتی

سیم تن تم سہی مگر صاحب
کس کو پروا تمھاری نہیں ہوتی

افضل | جناب ساحر نے ارباب محفل سے افضل نظام علی خاں ابن حکیم وارث علی خاں ہمدانی کا تعارف کرایا، یہ میرے دوست ہیں، ذی علم ہیں۔ قاضی باقر علی خاں ہمدانی قاضی شہر کے برادر زادہ ہیں۔ آج کل عہدہ بخشی گری پر ممتاز ہیں۔ شعر و شاعری سے دلچسپی ہے، ان کے نامہ و پیام نثر کے بجائے منظوم ہوتے ہیں۔ ان سے فرمائش کی گئی ایک فارسی کی غزل سنائی، اردو کے تین شعر یاد آئے وہ سنائے۔ فرماتے ہیں ؎

نہ ہوئی اشکوں سے آہ دل سوزاں ٹھنڈی ۔ آگ کر دیتی ہے گو دیدۂ گریاں ٹھنڈی
گرم اغیار سے واں رہتی ہے صحبت ہر دم ۔ شام سے ہوتی ہے یاں بزم غریباں ٹھنڈی
مر گیا آتش فرقت سے جو افضل جل کر ۔ تو ہوئی نعش نہ تا گور غریباں ٹھنڈی

شیون | افضل کے بعد شیون سے کہا گیا۔ وہ کہتے ہیں ؎

۱؎ تصویر الشعرا۔ شعر و سخن۔

اس طرح کا آرام میسر ہو کہاں اور | بہتر نہیں مرقد کے سوا کوئی مکاں اور
بہکانے پہ غیروں کے نہ کیجے گا گماں اور | دشمن ہیں کہا یہ کہتے ہیں یہاں اور وہاں اور
عالم میں سوا تیرے نہیں ہے کوئی اپنا | دروازہ ترا چھوڑ کے جاؤں میں کہاں اور
کچھ خیر تو ہے جاتے ہیں اٹھ اٹھ کے کہاں آپ | بتلائیے صاحب مجھے ہوتا ہے گماں اور
تنگ آ گئے میرے نالوں سے ہمسایہ یہ بولے | اٹھ جائیے بس ڈھونڈھیے اپنا کوئی مکاں اور
مستو! وہی بس آتے ہیں پھر بادہ کشی کے | کچھ روز کا مہماں ہے ماہ رمضاں اور
سنکر یہ اشعار وہ فرماتے ہیں شیون | بندش ہے یہ کچھ اور یہ ہے طرز بیاں اور

کچھ لوگوں نے داد دی مگر مرزا غالب نے مقطع پر تیور بدلے پھر خاموش ہو گئے۔

شورش جناب راجہ صاحب نے میر زین العابدین خاں شورش سے کہا کہ آپ اپنی غزل سنائیے چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

ہے قرص قمر پرتو انوار کسی کا | کچھ برق میں ہے جلوۂ رخسار کسی کا
کرتے ہو درستی شکن زلف کی تم یاں | دم ٹوٹ رہا ہے پس دیوار کسی کا
ہم محو رخ یار ہیں اوروں سے ہمیں کیا | یوسف کو خریدے نہ طلبگار کسی کا
عیسیٰ کو دم قصد شفا جیسی یہ جبیں ہو | صلواتیں سنا دیتا ہے بیمار کسی کا
بے فائدہ ہے چشم وفا یار سے شورش | ممکن ہی نہیں ہووے وہ اب یار کسی کا

راجہ ساحر صاحب نے دست بستہ راجہ صاحب سے کہا۔ اب آپ کچھ ارشاد
فرمائیں، مرزا غالب بولے۔ بلوان سنگھ کب سے شاعر ہو گئے کبھی
ہم نے تو کبھی ان کا کلام سُنا نہ دیکھا، خیر میاں آسی کی صحبت سے شعرا میں داخل
تو ہو گئے۔ یہ سُن کے راجہ صاحب کچھ شرمندہ سے ہوئے مگر بیخبر صاحب نے
ہمت دلائی اور مرزا صاحب سے کہا نو مشق ہیں مگر کہتے خوب ہیں، آخرش
سب کے کہنے سُننے سے یہ اشعار سنائے ؎

چرچے جہاں میں تیزیِ خنجر کے رہ گئے — مقتل میں ہم سے سیکڑوں بے سر کے رہ گئے
خالی کئے جو یار نے غیروں کے ساتھ جام — آنسو ہماری آنکھوں میں بھر بھر کے رہ گئے
پہلو میں بیٹھ کر مرے اک دم وہ چل دئے — سب دل ہی میں حوصلے دلِ مضطر کے رہ گئے
میخانہ اس کے اُٹھتے ہی ویرانہ ہو گیا — کچھ ٹکڑے ٹوٹے شیشہ و ساغر کے رہ گئے

راجہ رہا نہ تاجِ فریدوں نہ تختِ جم
افسانے کیقباد و سکندر کے رہ گئے

خواجہ بے خبر مرزا صاحب نے بھی تعریف کی۔ اب اہل مجلس کی نگاہیں
خواجہ بیخبر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے کہا فارسی
کی غزل سُنانا بے محل ہے اُردو میں دو چار شعر مرزا عبدالقادر بیدل کی
اقتدا میں کہہ لئے ہیں وہ آپ حضرات کی ارشاد کی تعمیل میں پیش کئے دیتا ہوں
پہلے رباعی عرض کرتا ہوں۔ مرزا صاحب ملاحظہ ہو ؎

جس چیز کو یہاں دیکھئے وہ فانی ہے   آبادی اس جہان کی ویرانی ہے
اس بزم میں سب بیٹھے ہیں اٹھ جانے کو   ہر جمع کا انجام پریشانی ہے

مرزا صاحب اور تمام اہل محفل نے تعریف کی بیخبر صاحب اور صنم سے ان دونوں
شکر رنجی سی تھی فرماتے ہیں ؎

کیوں کر خبر کریں گے کسی بے خبر سے ہم   زخمی ہوئے ہیں آپ کی تیر نظر سے ہم
دونوں کی رنجشیں ہیں برابر بڑھی ہوئی   ہم سے خفا وہ شوخ ہے اس فتنہ گر سے ہم
دل توڑ مت کسی کا خدا کا ہے گھر صنم   لائیں گے اس طرح کا مکاں ہم کدھر سے ہم

غالب حضرت بیخبر نے کہا۔ لیجئے حکم کی تعمیل ہو چکی، مرزا صاحب!
اب آپ بھی کچھ ارشاد فرمائیے۔ ارشاد کیا ؎

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

پاتے ہیں یہ جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

ہر ایک نے دل کھول کے داد دی مگر شیون نیچی نگاہ کیے ہوئے تھے
بچھڑے مل لئے صحبتِ احباب ختم ہوئی۔

سنہ ۱۲۴۵ھ کا واقعہ ہے مہاراجہ بلوان سنگھ کے یہاں مشاعرہ تھا، عمائدِ شہر اور شعرا شریکِ محفل تھے، راجہ کے استاد خلیفہ گلزار علی اسیر آئے راجہ نے اپنے داہنی طرف جگہ دی۔ ان کے ساتھ حکیم غلام قطب الدین خاں باطن اور مولوی سید محمد علی تپش سبزواری بھی تھے۔ خلیفہ صاحب متوسط قد سانولا رنگ، سر پہ کلہ، مونچھیں بڑی، ریش خشخاشی، انگرکھا بالے دار پہنے کاندھے پر ایک گزی رومال پڑا ہوا، اگلے لوگوں کی سی پگڑی باندھے ہوئے تکیہ سے لگ کر مسند پر بیٹھ گئے۔ راجہ صاحب نے کچھ عرصہ سے مرزا حاتم علی بیگ مہر کو بھی استاد بنایا تھا، پچاس روپیہ ماہوار دیا کرتے مہر ناسخ کے شاگرد ہیں۔ رکن الدولہ مرزا امراؤ خاں بہادر اصفہانی مصاحب نادر شاہ ایرانی کے پوتے اور مرزا فیض علی بیگ قزلباش کے خلفِ رشید ہیں علمی استعداد معقول ہے۔ کشیدہ قامت، رنگ گندمی، کلہ صاف مونچھیں گھنی اور بڑی بالے دار، انگرکھا پہنے ہوئے، قبہ نما ٹوپی۔ فرق پر چوڑی دار تنگ موری کا پاجامہ پہنے ہوئے، چھڑی ہاتھ میں امیرانہ طور طریق محفل میں آئے۔ راجہ صاحب نے بائیں طرف بٹھایا۔ ان دونوں کے آگے چاندی کے حقے لگائے گئے۔ بقول پروفیسر شہباز خلیفہ صاحب حقہ نہیں پیتے تھے اور انہوں دونوں سے ذوق رکھتے تھے، ان کو یہ چھوٹی جنجال کا حقہ کیا

جلا گیا۔ ساقی جو اور خضار کے حقہ پلانے کو مقرر تھی، اُس کو بُلاتے اور اُس کے گرما گرم اور دھواں دار حقہ سے اپنی خواہش کی آگ کو بجھاتے۔ پہلے پہل جب یہ حرکت ان سے ظہور میں آئی تو مرزا مظہر نے کنایۃً کہا۔ "حضرت! کیا خوب اب تو آپ کی طبیعت کسی اور ہی طرف مائل ہے" خلیفہ صاحب نے چھوٹتے ہی یہ شعر پڑھا ؎

دل میں الفت ہے جو اک سانولی متوالی کی
گو مسلماں ہوں پہ بول اُٹھتا ہوں جے کالی کی

مرزا صاحب نے داد دی اور عرض کیا۔ حضرت مشاعرہ میں ابھی دیر ہے ایک نظم صنعت ایہام میں کہی ہے وہ سنیے گا اور خان باطن ذرا آپ بھی توجہ فرمائیں ؎

حال دل مہر کا کھلا ہمدم | درد ہمدردِ دل ہوا ہمدم
کس طرح کا معاملہ ہوگا | وصل اُس کا اگر ہوا ہمدم
اللہ اللہ آہِ سردِ سحر | گرم کس کس طرح ہوا ہمدم
ہم کو اس لعل کا دکھا عالم | مُسکرا کر لہو رُلا ہمدم

دیکھو مظہر اس کو لکھو اور طرح
دُردِ کلکِ مدام لا ہمدم

لہ زندگانی بے نظیر از پروفیسر شہباز

جناب آسی نے خوب خوب داد دی اور کہا - مرزا صاحب! کچھ شعر
راہ میں خیال میں آ گئے ہیں ایک شعر ملاحظہ ہو

مال رہ جائے کسی پاس نہ دولت رہ جائے
یہ بڑی چیز ہو دنیا میں جو عزت رہ جائے

اتنے میں آگرہ کے مشہور نادرہ سنج ، لطیفہ گو کالے خاں سفلی آموجود ہوئے
اکثر اصحاب کے سامنے راجہ صاحب نے بلوریں حقے بھی رکھوا دیئے تھے
اور آپ خود سنگ پی رہے تھے ۔ راجہ صاحب کا میانہ قد ، موٹے تازے
رنگ گورا چٹا ، چہرے پر داڑھی مونچھ دراز ، گول چہرہ ، سفید لباس ، دھوتی
اُس پر اچکن ، دو پلڑی ٹوپی پہنے ہوئے ، سفلی نے محفل میں یہ رنگ جو
دیکھا تو فی البدیہہ یہ کہا ع

دور سے تو وہ بلور نظر آتا ہے

راجہ صاحب نے مصرع سُنا اور حقہ کا سٹک منہ میں لے کے ایک کش
لیا - اُس پر دوسرا مصرع بھی سفلی کہتے ہیں ع

دم چھپاتا ہوا لنگور نظر آتا ہے

تمام محفل کھل کھلا کر ہنس پڑی ۔ راجہ صاحب مسکرا دیئے ۔ بعد ختم مشاعرہ
ایک شال محلسرا سے طلب کی اور سفلی صاحب کو اُڑھائی سلام کر کے فرماتے ہیں

قائم رہے یہ راجہ کاشی کی سلطنت
یہ ایک طلسم گاہ ہے دربار ہی نہیں

ایک دن ہر دو استاد صبح راجہ صاحب کے یہاں ٹہلتے ہوئے آنکلے
یہاں بھنگ گھٹ رہی تھی تیاری پر چاندی کے کٹوروں میں ہر ایک کے سامنے
لائی گئی بھرتے انکار کیا اور فرمایا ؎

نشہ میں بھنگ کے ہوں فکر ہو مضمونِ عالی کی

خلیفہ صاحب کٹورہ ہاتھ میں لے کے چڑھا گئے اور بولے ؎

چڑھائی بھنگ کی ٹھنگی، صراحی مے کی خالی تھی
نشہ میں بھنگ کے ہم نے بھی کیا نازک خیالی کی

اُن دنوں اسیر کی شاعری کی جوانی تھی شاگردوں کا ایک جم غفیر
ہر وقت ان کے ساتھ رہا کرتا۔ منشی نبی بخش حقیر سخن فہم سخن سنج شاگرد
تھے، ہر وقت مونچھوں پر تاؤ دینے کی عادت تھی۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ شعرا "گلشن بے خار" آگرہ پہونچا۔
حضرت شیفتہ حکیم مومن خاں مومن کے قابل فخر شاگرد تھے ایک تو خود نوابی مزاج
اس پر حکیم صاحب کی تعلیم جو دنیا میں سوائے اپنے کسی کو کچھ نہ سمجھتے تھے، "ذوق
کوئی چیز نہیں"، "شاہ نصیر کو کیا آتا ہے"، "فلاں مہمل گو ہے"، "فلاں جھک مارتا
ہے"۔ غرض کہ یہ باتیں رہتی تھیں۔ فارسی میں میر ناصر علی سرہندی کا ہم پایہ
اپنے کو سمجھا گئے، اردو میں بیدل کا مد مقابل جانتے تھے، اس پر پہونچی

مرزا غالب کی شہ بقول ہمیر ع

سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا

تذکرہ کا نام رکھا "گلشن بے خار" ع

بر عکس نہند نام زنگی کافور

ہر ایک کو خارزار میں الجھائے بغیر نہ چھوڑا۔[1]

مرزا نوشہ غالب، مفتی صدرالدین خاں آزردہ، حکیم مومن خاں مومن

غلام علی خاں وحشت، صاحبہ حکیم مومن خاں کی آشنا، دمجھو طوائف خود کی داشتہ تخلص نزاکت، "سخن شعرا" نساخ سے نزاکت کا شعر نقل ہے ؂

بس کہ رہتا ہے یار آنکھوں میں ہے نظر نے قرار آنکھوں میں[2]

غرض کہ ہر ایک کے ساتھ خلش ان کے سوا ہر ایک کے ساتھ چھیڑ۔ اس عام کاوش میں میاں نظیر کی بھی شامت آگئی:-

"اشعار بسیار دارد کہ بہ زبان سوقیین جاری ہست"

میاں نظیر کی اس وقت کے لوگوں کے دلوں میں ولی اللہ جیسی قدر تھی، نواب شیفتہ کی گستاخی ناگوار گزری۔ خلیفہ گلزار علی اسیر نے یہ تذکرہ جو پڑھا آگ بگولا ہو گئے۔ ان کے جرگہ کے رکنِ رکین حکیم غلام قطب الدین خاں باطن، نظیر کے شاگرد ذی علم و خوش استعداد بزرگ تھے۔ حکیم محمدی ظاہر ابن حکیم واجد علی تھے۔ ظاہر صاحبزادہ محمد یسین ابن ٹیپو سلطان کے اتالیق

[1] زندگانی بے نظیر ۲۳ [2] سخن شعرا صفحہ ۵۸ مرزا ابو محمد عبدالغفور نساخ۔

سے تھے، اس سرکار سے معقول مالی امداد ملتی رہی، باطن بھی مستفید رہے سرکاری مدرسہ میں معلمی کر رکھی تھی، نثر و نظم میں قدرت کامل تھی۔ بیٹھے بیٹھے مثنوی میر حسن کا خمسہ کر ڈالا۔ اعجازِ رقم تاریخی نام رکھا۔ بقول شہباز کو عمر نے ان کی آگ کو کسی قدر افسردہ کر رکھا تھا، لیکن خلیفہ صاحب کی زبان درازی نے پنکھا جھل دیا، آگ بھڑکی اور غضب کی بھڑکی۔ جواب میں "گلستانِ بے خزاں" لکھ ماری، اس میں جو گیند سے یا ہزارے ہیں غصے کے انگارے اور غضب کے شرارے ہیں۔ "گلشنِ بے خار" کی شیدا بلبلیں چیخ اٹھیں کہ شیفتہ کے گلشن میں باطن کی آتش بیانی سے آگ لگی۔ انشا کہتے ہیں ؎

گلشن میں مگر پھول جھڑا اس گل رو سے کیوں ورنہ چلی آتی ہے یوں بادِ سحر گرم

نواب شیفتہ نے نظیر اور ان کے دوستوں اور شاگردوں سے جتنی بے اعتنائی برتی باطن نے اپنے تذکرہ میں اس کا جواب دیا۔ انھوں نے جن کو برا لکھا انھوں نے ان کو خوب سراہا[1]۔ اپنے استاد اور استاد زادہ کے جرگہ کو بہت کچھ ظلمت گمنامی سے نکالا۔ شیفتہ، غالب، آزردہ مومن کی دل کھول کر مذمت کی۔ مثلاً:

"مومن تخلص، مومن خاں نام ساکن شاہجہاں آباد، شاگردانِ سخن کے استاد۔ اگر نورِ باف سحر بیاضِ فکر دیکھے تو صحن خانہ سے کوچ کر آئے۔ کشتیِ الفاظ سے اس کے ہوش میں خرابی پائی جائے، رشتۂ جاں تار تار ہے، رشک مضمون سے ہر شاعر ہاتھ ململ کے بے قرار ہو۔ کلام میٹھا ایسا گاڑھا کر

[1] زندگانی بے نظیر۔

جس کی جرأت ہے شیریں زباں مثل کوہ کن شور مچائیں۔ نشۂ شراب الفاظ
سے مخموران خمخانۂ سخن دستار کو ہوا میں اڑائیں الخ"

عبارت بالکل نو رتن جیجور کے طرز پر ہے ' التزام ضلع مثلاً اوپر جولانیوں کا ضلع ہے ایسے ہی کہیں صرف کا کہیں نحو کا۔ فتوی و فرائض کا کہیں نجوم کا رعایت لفظی سے اکثر شاعروں کے حالات کو چمکایا ہے۔ دیباچہ بھی رعایت لفظی کی ملکہ بات ہے۔ غزل، مخمس، ترکیب بند، رباعی کے گل بوٹے استعارے اور تشبیہ کے نور سے چمک رہے ہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو[1]

وہ ظرف ہی خم وحدت کو میں چڑھا جاتا
ترا جمال جو اس جام میں سما جاتا

باطن کے دوست مولوی سید واجد علی صاحب شمس العلوم تھے وہ بھی ایسا ہی مزاج رکھتے تھے، انشاء اللہ خاں کی "دریائے لطافت" میں دلی اور لکھنؤ کی زبان کے ذکر کے سوائے کچھ نظر نہ آیا۔ فوراً "گلدستۂ انجمن" لکھ ڈالا۔ اس میں انشا کے بڑے لتے لئے ہیں۔ دن رات ہی علمی نوک جھوک رہا کرتی۔

۱۲۸۰ھ میں حضرت مولانا غلام امام شہید اور منشی خواجہ غلام غوث بیخبر خان بہادر ذوالقدر میر منشی لفٹنٹ گورنر مغربی شمالی الہ آباد سے آگرہ آئے۔ مولوی اظہار حسین ذوالقدر بھی آئے ہوئے تھے۔ صدر نظامت کے مشہور وکیل بابو بینی پرشاد نے ایک عظیم الشان پیمانہ پر مشاعرہ کیا۔ جس کی

[1] زندگانی بے نظیر

روداد مولوی اکرام اللہ گوپامؤی اور علی حسین قیصر نے مرتب کرکے شائع کی۔ قہر صاحب نے بھی ایک صحبت شعر و ادب اپنے یہاں قائم کی۔ اساتذۂ اکبر آباد شریک ہوئے۔ شہید و بیتخبر بھی محفل میں تشریف لائے۔ کالے خاں سفلی آگے جو بیٹھے چہرہ اداس۔ عرائض نویسی کرتے تھے، خالی ہاتھ تھے، بپاس وضع داری شامل ہونا ضرور۔ قہر نے سفلی کے چہرہ کو دیکھ کے خادم سے قلمدان طلب کیا۔ کچھ نقدی نکال کے ہتھیلی پر رکھ کے بطور نذر پیش کی۔ سفلی کو یہ طرز برا لگا کہتے ہیں:

سفلہ نے رکھ کے کف پہ اگر زر دیا تو کیا
اہلِ کرم کی علتی ہو عشق پسند ہی ہوئی

مرزا قہر نادم سے ہوگئے اور اپنے اضطراب کی معافی چاہی اور کنور رچکرورتی سنگھ متخلص بہ کنور برادر زادہ مہاراجہ بلوان سنگھ سے کہا۔ کنور صاحب! کچھ فرمائیے اور مجلس کو گرمائیے۔ کہتے ہیں ؎

رتبہ ہے عشق سے دل الفت مآب کا — عنوان ہے یہ نام خدا اس کتاب کا
بندہ ہوں جان و دل سے رسالت مآب کا — چھوڑوں گا روز حشر نہ حلقہ رکاب کا

حامی ہیں جن کے حیدرِ کرار اے کنور
روزِ جزا میں خوف اسے کیا حساب کا

کنور کے چھوٹے بھائی بابو رن بہادر سنگھ ابن کنور فتح سنگھ راجہ صاحب کے شاگرد ہیں کہتے ہیں ؎

وصل میں منہ موڑ کر کیوں سو گئے — کیوں تم اتنے بے مروت ہو گئے

ہے یہ دنیا بھی گزارے کی سرائے
رو نہ اس میں چار آئے دو گئے

غیر سے دلوائی میری فاتحہ
آ کے تربت پر کبھی کانٹے بو گئے

مر مٹے ہم جستجوئے یار میں
ڈھونڈتے ہی ڈھونڈتے بس رو گئے

تم نے خنجر سے نہ منہ موڑا کبھی
لوگ کی سے گر بہادر ہو گئے

قیصر علی حسین کو مرثیہ خوانی کا شوق ہے۔ دل طبع ہیں، مطبع قیصری قائم کر رکھا ہے جو غزل سنائی صرف ایک شعر ہی ہے:

تم تو خفا ہو، ہم کو گلے سے لگائے کون
فرمائیے تو دل کی لگی کو بجھائے کون

مرزا مہر نے آغا مرزا آغا حسین سے کہا "مرزا صاحب! آج تو آپ کی نگاہیں شوخی پر ہیں۔" ان کے سامنے درگا بائی صنم اور کالی خانم بیٹھی ہوئی تھیں اور گھڑی گھڑی آغا پر نظریں ڈال رہی تھیں۔ یہ مسکرائے اور فی البدیہہ کہا:

کبھی ہنس کر ذرا بولے کبھی پیش آئے گالی سے
خدا محفوظ رکھے اس مزاجِ لاابالی سے

برہمن پوجتے ہیں بت کو، میں مردِ مسلماں ہوں
نہ درگا سے غرض مجھ کو، نہ کچھ مطلب ہے کالی سے

دونوں خفیف ہو کر رہ گئیں۔ تمام مجلس نے لطف اٹھایا۔

کہتے ہیں:

سکۂ داغِ جنوں ملتے، جو دولت مانگتا
تنگ کرتی مفلسی، گر میں فراغت مانگتا

خضر کی سی زندگی ہوتی جو مجھ ناکام کی
میں دعائے وصلِ جاناں تا قیامت مانگتا

کس کی آمد آمد اپنے کلبۂ احزاں میں ہے
پیشوائی کو ہر دل، پہلو سے رخصت مانگتا

دشتِ وحشت خیز میں عریاں تن آغا آپ ہے
قاصدِ جاناں کو کیا دیتا، جو خلعت مانگتا

آغا صاحب کے دوست شیفتہ احمد خاں قادری ابنِ لطف اللہ سپاہی پیشہ فوج میں ملازم، مگر شعر گوئی کا شوق، مثنوی "لطیفۂ غیبی" بھی لکھی ہے، چوڑی دار پائجامہ اور اچکن پہنتے ہیں، کمر پر سہ گوشہ رومال پٹے بازوؤں کی طرح باندھا کرتے ہیں، پگڑی بانکی باندھتے ہیں، کمر میں ایک طرف سیف اور دوسری طرف خنجر حمائل رہتے، شعر پڑھنے کا ڈھب نرالا معلوم ہوتا ہے، پنجہ کشی کی تیاری ہے۔ اسیر سے تلمذ ہے چند شعر سنئے:

کھلا نہ آج تلک دل کی آرزو کیا ہے
یہ چاہتا ہے کسے، اس کو جستجو کیا ہے

تمھیں بتاؤ قیامت کو کیا وہ دیکھے گا
نہ دیکھا جس نے قریبِ رگِ گلو کیا ہے

نہیں ہے رنگ تمہارا تو کیا ہے گلشن میں
تمہارا فیض نہیں ہے تو گل میں بو کیا ہے

بہک نہ شیفتہ، ہو اس قدر نہ دیوانہ
زباں سنبھال، یہ بیہودہ گفتگو کیا ہے

ارباب محفل نے جناب راجہ سے کہا۔ "مہاراجہ صاحب! اب آپ کے ارشاد فرمانے کا وقت ہے" مرزا چھجو نے بھی اصرار کیا۔ فرماتے ہیں ؎

لب دنداں کے تصور میں جو نالہ نکلا — آگ سینہ میں لگی، چشم سے دریا نکلا
تجھ سے صیاد کو پیدا ہوا جب ذوقِ شکار — طائرِ قبلہ نما، توڑ کے بیضا نکلا

چتر ہے داغِ جنوں سر پہ تو نالہ ہے نقیب
دشتِ وحشت میں عجب دھوم سے راجا نکلا

مرزا چھجو نے خواجہ بیخبر سے کہا۔ "حضرت! آپ کو معلوم ہوا مجھے صدر نے منصف کرنا چاہا تو احباب نے کانٹے بازی کی اس پر ایک قطعہ لکھا ہے وہ پیش ہے ؎

امیدوار کیا جج نے منصفی کا مجھے — تو مجھ سے ہو گئی ناحق کی حاسدوں کو کد
دیا سوال مری ضد پہ صدر نے ادھر — ہوا وہاں سے بھی آخر سوال ان کا رد
ملا ذریعۂ کامل خدا کا فضل مجھے — اثر نہ ہوگا عدو کا بغض و حسد

نکالوں سائلِ موذی کو اب لکھوں تاریخ
عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

خواجہ صاحب نے قطعہ پسند کیا اور حضرت شہبیدیں کو یونگی کان سے لگا کر سنایا

تھرا کہتے ہیں ؎

اس دور میں ہر اک تہ چرخ کہن لٹا
اوروں کا زر لٹا، مرا نقدِ سخن لٹا

بلبل کو کیسی کیسی ہوئیں آفتیں نصیب
گلچیں کے دستِ ظلم سے کیا کیا چمن لٹا

نباش کی جفائیں ہوئیں ہم بعدِ مرگ
اے آسمان زیرِ زمیں بھی کفن لٹا

ساقی وہ آج ہے نہ وہ پیمانہ آج ہے
جو کل کا ماجرا تھا سو افسانہ آج ہے

کل تک حباب پہ بادہ کشتوں کا ہجوم تھا
سن سان سا پڑا وہ ہی میخانہ آج ہے

دیکھا تھا جن کو بزم میں کل ہم نے بخشیں
وہ شمع آج ہے، نہ وہ پروانہ آج ہے

ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ تھرا کی چشم سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے، راجہ صاحب اور تھرا نے خواجہ صاحب[1] سے کہا حضرت اب آپ

---

[1] خواجہ غلام غوث بےخبر ابن مولوی حضور اللہ کشمیری سلطان زین العابدین کی اولاد سے تھے حکومت خاندان سے گئی تو حکومت مغلیہ کے عہد میں عہدۂ قضاء کشمیر پر ممتاز رہے۔ کچھ عرصہ تبت بھی رہے پھر بنارس آ رہے ہیں۔ بےخبر فارغ التحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ ہوئے۔ ان کے خالو خان بہادر میر منشی لفٹنٹ گورنر صوبہ مغربی و شمالی تھے، ان کے نائب ہو گئے، انھوں نے پنشن لی تو یہ میر منشی ہو گئے۔ فارسی میں مرزا بیدل رنگ، اختیار کیا۔ نظم و نثر میں قدرت کامل ہے۔ تھرا سے خصوصیات تھیں وہ کہتے ہیں ؎

منشی غلام غوث ہیں مشہور بےخبر
ہم کو بھی بےخبر کر اے تھرا کم ہوا

ان کے علیل ہونے کا فصل و بائی تھی
مطلق نہ ہم کو علم خدا کی قسم ہوا

اب جو سنا تو رنج ہوا پھر یہ شکر ہے
اس سے سوا خوشی ہوئی جتنا کہ غم ہوا

ہاتف نے ایک مصرع تاریخ پڑھ دیا
اچھی طرح سے ہیں یہ خدا کا کرم ہوا

(صحیفۂ زریں و خمخانۂ جاوید حصہ اول، تاریخ ادب اردو، انشائے بےخبر وغیرہ)

فرمائے۔ انھوں نے پہلے تو معذرت کی پھر کہتے ہیں ؎

فقیروں سے کرتے ہو جو بولی ٹھولی — بہت پیاری باتیں ہیں یہ بھولی بھولی
بھکاری ہیں تو! ہم تو دیدار کے ہیں — بھلا ہوگا بھر دو ہماری بھی جھولی
لگاتے ہیں منھ کب ہم اس فاحشہ کو — گرے ہم سے کیوں قحبہ دنیا ٹھٹولی
نہیں بند رہتا کوئی کام اپنا — گرہ دل کی ہو جب مرشد نے کھولی
پری آج شیشہ سے داتا نکالو — یہ کالی بلا کیسی افیون گھولی
زمانہ دکھائے گا کیا رنگ ہم کو — جو ہونی تھی اپنے لئے بس وہ ہولی
کہاں ہم فقیر، اور دنیا کے جھگڑے — یہ کیچڑ تو دامن سے پہلے ہی دھولی

حضرت شہیدؔ نے اصرار کیا مگر آپ نے فرمایا مشاعرہ میں بھی فارسی کے اشعار پڑھتے تھے مجلس برخاست ہونے لگی سفلی فرماتے ہیں ؎

سفلی، سوائے نیر اعظم جناب مہر — ہمچھے تمھارے شعر کسے امتیاز ہے

مہر و ضیغم میں انس کی پینگیں بڑھنے لگیں کبھی ساحر کے یہاں کبھی اپنے یہاں شطرنج بچھائی اور سر جوڑ کے بیٹھ گئے اور ایسے کھیلے دن تو دن رات بیت گئی ہے ؎

شطرنج میں بھی ان کا بھل جائے تو اچھا
اے مہر یہ چال اچھی ہی چل جائے تو اچھا

ایک دن دونوں میں نوک جھوک رہی ضیغم کہنے لگے ؎

ستم ہجراں ہے کافی دل لگی کو — یہی مونس مرا ہے اور میں ہوں

پھر بولے ؎

ذرا آسنے تو دے روزِ قیامت ۔ صنم تو ہی خدا ہی اور ہمیں ہوں

آگرہ میں میلۂ طوائفان ہوا کرتا تھا، صنم کی فرمائش سے ایک قطعہ کہا ؎

مہوشوں نے کیا میلہ ایجاد ۔ پھر دل لینے کا ساماں دیکھو
اکبر آباد جو ہے رشکِ چمن ۔ اُس میں اک تازہ گلستاں دیکھو
میں بھی اب مصرعِ تاریخ لکھوں
نقشۂ بزمِ پرستاں دیکھو

آگرہ میں اکثر ایسی صحبتیں آئے دن ہوتی تھیں اب صرف ذکر باقی رہ گیا ہے ؎

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں